ریاست مدینہ میں نظام زکوٰۃ کا فروغ اور سود کی تحریم و تعدیم

The Promotion of Zakat and the Prohibition of Interest in the State of Madinah

ڈاکٹر عارف خان ساقی*

Abstract

Prophet Muhammad ﷺ had successfully turned Madinah into an effective welfare state in the modern sense of the term. 'Interest' was forbidden without any ambiguity. It was considered to be the womb of social and economic evil. From theoretical illumination to its complete political enforcement, prophet Muhammad ﷺ had prevented the indigenous people from the uncountable bad effects and socio economic repercussions of interest of the time.

As an alternative, off course with the commandments of Allah almighty, the system of zakat was established with its intrinsic spirit in response to the interest. Under the light of divine commandments, Muslims, be men or women, with specific conditions like minimum particular amount for a certain period under specific conditions were asked to pay zakat. It was implemented and enforced with all its spiritual and material requirements. The paper argues that the enforcement of zakat should be construed as comprehensive financial system of the state of Madinah. As any modern state, the state of Madinah distributed this amount to the needy and served the citizens. It will provide scientific evidences to support this argument.

Keywords: *Madinah, Zakat, Economic Evil, Interest, Financial System.*

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی، کراچی۔

رسولِ کریم ﷺ نے ایک مؤثر و جامع حکمتِ عملی کے تحت ریاستِ مدینہ کو ایک فلاحی و تعمیری ریاست بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے معاشرے کے ان لوگوں کو جو سود کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، بعافیت اس سود کے پیدا کردہ دیرینہ و مہلک امراض سے پوری طرح سے نجات دلادی تھی۔ اور سودی نظام کے متبادل کے طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کے تحت آپ ﷺ نے نظامِ زکوٰۃ قائم فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے ایک خاص سطح کی مالیت یا قوتِ خرید کے حامل لوگوں کو مالدار قرار دیا۔ ساتھ ہی یہ امر بھی طے ہو گیا کہ مالدار وہی شخص کہلائے گا جس کا مال سال گزشتہ میں کسی بھی موقع پر مالیت کی اس مقررہ وطے شدہ سطح سے کم نہ ہوا ہو۔ اگر کسی وجہ سے دوران سال میں یہ سطح کم ہو گئی تھی تو جب سے دوبارہ اس کا مال اس مقررہ وطے شدہ مالیت کی سطح کو پہنچے گا تب سے ہی مدت شمار ہو گی۔ اور ایک سال کے بعد وہ اپنے مال کا ڈھائی فیصد حصہ بطورِ زکوٰۃ ادا کرے گا۔ مال اور مالیت کی یہ سطح خود رسولِ کریم ﷺ نے مختلف النوع اموال میں متعین بھی فرمادی تھی۔ مویشیوں میں ان کی تعداد اور سونے و چاندی یا غلہ و اجناس وغیرہ میں آپ ﷺ نے الگ الگ مقداریں مقرر فرمائی تھیں جو ایک ہی سطح کی مالیت کا تعین بہت عمدگی و جامعیت کے ساتھ کرتی تھیں۔ آپ ﷺ نے نظامِ زکوٰۃ کے ضمن میں ان وقتوں میں ناگزیر جملہ قواعد و ضوابط وضع فرما کر عملاً نافذ بھی فرمادیئے تھے۔ اس طرح اسلام کے نظام زکوٰۃ کو ریاستِ مدینہ کے نظام مالیات کی اساس کے طور پر ہی دیکھنا اور تعبیر کرنا چاہیے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حیاتِ اجتماعی کے لیے جو بھی نظام قائم فرمائے ہیں ان کو نام و عنوان ایسے عطا فرمائے ہیں کہ پورا نظام ہی اسم با مسمّٰی بن جاتا ہے۔

اسلام کے دیئے ہوئے زکوٰۃ کے نظام کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے پہلے لفظِ ''زکوٰۃ'' کا حقیقی فہم ضروری ہے۔ یہ لفظ بھی لفظِ ''صَلٰوۃ''، ہی کی طرح ہے اور اسی وزن پر ہے۔ اس کے معنوں میں بھی وہی جوہر موجود ہے جو لفظ ''صَلٰوۃ'' کے اندر پایا جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ''صَلٰوۃ'' میں ''بھوننا'' اور ''جلانا'' بھی لفظ کے معنوں میں اصلاً شامل ہے۔ مگر لفظِ ''زکوٰۃ'' میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔ ''پاکیزگی اور شفافیت'' اس لفظ کا بنیادی معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں نماز کا ذکر آیا زکوٰۃ کا ذکر بھی اس کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ دراصل نفس کی کثافتوں اور آلائشوں میں اضافہ سے شیطانی اثرات بڑھتے جاتے ہیں۔ جبکہ پاکیزگی اور شفافیت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی اور کھینچتی ہے۔ حتیٰ کہ سراپا رحمت اور فضل و کرم بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب کی آیت ۵۶ میں تمام مسلمانوں کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں کثرت سے درود و سلام کی شکل میں جو ہدیہ نیاز پیش کرتے رہنے کا حکم دیا ہے اسے بھی ''صَلٰوۃ''، ہی کہا گیا ہے۔ اس سے مراد بھی ''ایسی پاکیزگی اور شفافیت ہے جو سرتاسر رحمت الٰہی کی صورت اختیار کر چکی ہو''۔ تقریباً اسی اسلوب پر ''پاکیزگی اور شفافیت'' کے معنی میں ''زکوٰۃ'' کا کلمہ قرآن حکیم میں بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حضرت یحیٰ علیہ السلام کو جو نعمتیں عطا ہوئیں ان کے تذکرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا (۱)

ترجمہ: اور ہم نے اپنی بارگاہِ خاص سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ تھا ہی پرہیزگار۔

زکوٰۃ کا ایک معنی ''بڑھنا'' اور ''نشو و نما پانا'' بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یہ معانی اس لفظ کے حقیقی اور بنیادی معانی نہیں بلکہ ''پاکیزگی اور شفافیت'' کا لازمی نتیجہ ہیں۔ صرف روحانی ہی نہیں مادّی فروغ اور نشوونما کے لئے بھی ''پاکیزگی اور شفافیت'' ایک

لازمی شرط کا درجہ رکھتی ہے۔ اسلام کا دیا ہوا نظامِ زکوٰۃ حلال طریقے پر کمائے اور حاصل کیے گئے مال و دولت میں سے ان مضر عناصر کا خاتمہ کر دیتا ہے جو انسان کی اپنی کوتاہیوں کے باعث اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور روحانی ترقی اور بالیدگی کے ساتھ ساتھ جسم انسانی کے لئے بھی نقصان کا سبب بن سکتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے خیر اور برکت بھی تبھی اس میں شامل ہوتی ہے جب یہ پاکیزہ اور شفاف ہوتا ہے۔ جس طرح ہم دودھ کو گندے برتنوں میں نہیں ڈالتے اور اگر ڈال بھی دیں تو پھٹ جاتا ہے اور خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خیر اور برکت کو بھی ایسا ماحول اور فضا راس نہیں آتی جو پاکیزہ اور شفاف نہ ہو۔

انسانی روح کی بالیدگی اور جسمانی صحت و سلامتی ہر دور میں چونکہ دین اسلام کی اولین ترجیح رہی ہے اس لئے انبیائے سابقین کے عہد میں بھی زکوٰۃ کا حکم موجود تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعلیمات کے ضمن میں قرآن حکیم میں ہے :

وَ كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (۲)

ترجمہ: اور وہ اپنے زیر اثر لوگوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تعلیم دیا کرتے تھے اور اپنے رب کی بارگاہ میں پسندیدگی کا مقام رکھتے تھے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے ہے:

وَ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (۳)

ترجمہ: اور میں کہیں بھی ہوں اللہ نے مجھے برکت کا باعث بنایا ہے، اور مجھے تاکید کی ہے نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک کہ میں زندہ ہوں۔

رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں کی مذہبی اور خلاقی حالت کی طرح معاشی اور اقتصادی حالت بھی بہت خراب تھی۔ تجارت اور دیگر جائز طریقے بھی تھے۔ مگر سرمایہ کاری کے تین بڑے میدان تھے جن میں لوگوں کا اکثر و بیشتر سرمایہ لگا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ سرمایہ تو غلاموں اور باندیوں کو خریدنے میں صرف ہوا تھا۔ باقی جو بچا اس کا زیادہ حصہ سودی کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ تیسرا بڑا سرمایہ کاری کا میدان شراب کا کاروبار تھا۔ ان تینوں پر اسلام نے قدغن لگائی اور ایسے متبادل دیے جن کی طرف لوگوں کی توجہ اور میلان کے باعث ادھر سے توجہ ہٹتی چلی گئی۔ ان سب میں جو چیز کینسر کی طرح اس معاشرے کو چاٹ رہی تھی وہ سود تھا۔ دیگر اقدامات کے علاوہ جس نظام کو سود خوری جیسے ظالمانہ نظام کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ فروغ دیا گیا وہ اسلام کا نظام زکوٰۃ ہے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی ﷺ کی تعلیمات میں بھی نماز کی طرح زکوٰۃ کا حکم بھی جاری و ساری رکھا گیا ہے۔ اور ان دونوں کو پاکیزگی اور شفافیت کے حصول کا ذریعہ بتایا گیا۔ نماز انسان کے جسم کی تطہیر کرتی ہے۔ جبکہ زکوٰۃ انسان کے مال و دولت کو پاک کرتی ہے۔

بناء بریں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نماز کے بعد جو عبادت ایک بندے کا رابطہ اس کے رب کے ساتھ قائم کرنے کے معاملے میں مؤثر ترین ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں زیادہ تر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ ہی آیا ہے۔ نماز ہو یا زکوٰۃ ان کے معانی پر غور کرنے پر ہی انسان پر ان کی عظمت، اہمیت اور فضیلت خوب واضح ہو جاتی ہے اور کسی طرح کا کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ پھر قرآن حکیم میں ان کی پابندی سے ادائیگی کا جو بار بار حکم آیا ہے، اس نے اس اہمیت اور فضیلت کو اور بھی نکھار دیا ہے۔ ایک اور حقیقت جو اس کی

اہمیت اور فضیلت کو بام تک پہنچادیتی ہے یہ ہے کہ زکوٰۃ شریعتِ محمدی کے ان احکام میں سے ایک ہے جسے ''اصول تدریج'' کے تحت پایہ تکمیل تک پہنچایااور عملاً نافذ کیا گیا ہے۔ ''اصول تدریج'' شریعت اسلامی کا ایک ایسا بنیادی اور نادر اصول ہے کہ جس کے ذریعے احکام کو درجہ بدرجہ آگے بڑھا کر اور آہستہ آہستہ ترقی دے کر پورا کیا گیا۔ اس اصول کا اضافی فائدہ یہ ہوا ہے لوگوں کو پوری طرح اس سے مانوس کر دیا گیا اور طبیعتیں اس کی عادی بن گئیں۔ جو حکم اس طرح سے طبیعتوں میں رچ بس جائے اس کو نظر انداز کر دینا پھر ممکن بھی نہیں رہتا۔ ''اصول تدریج'' کے تحت جو اضافی فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کو دھیان میں لایا جائے تو نظامِ زکوٰۃ کے ساتھ وابستہ قدرت کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں بھی قرآن حکیم میں زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے مگر اس وقت اس سے مراد عام طرح کے صدقات و خیرات ہی ہوتے تھے۔ شروع شروع میں صدقہ و خیرات کے لئے کوئی واضح حد بندی اور پابندی نہیں تھی۔ لوگوں کی مرضی اور ان کی صوابدید پر تھا کہ جو اور جتنا چاہیں غریبوں اور مسکینوں کو دے دیں۔ سخاوت اور فیاضی کی قدر افزائی کے باعث لوگ اپنا مال و دولت بے سہارا اور بے آسرا لوگوں پر صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ سابقہ شریعتوں میں زکوٰۃ کے حکم کی موجودگی کی اطلاع کے باعث ہی شائد مالیاتی نظم وضبط کی طرف جاری پیش رفت کے باعث لوگ یہ پوچھا کرتے تھے کہ اللہ کی راہ میں وہ کیا خرچ کریں؟ مگر ابھی حتمی حکم کا وقت نہیں آیا تھا اس لئے پہلے یہ تعلیم دی گئی :

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط (۲)

ترجمہ: آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔

عرب میں تجارتی سود کا رواج بھی تھا۔ مگر غربت کے مارے ہوئے لوگ بھی محض اس امید اور آسرے پر کہ جلد ان کے حالات بدل جائیں گے اور قرض خواہ کو اس کی رقم ادا کر دینے کے وہ قابل ہو جائیں گے، ساہوکاروں کے پھیلائے ہوئے جال میں جا پھنستے تھے۔ امیدوں کے سہارے نہ کبھی دَھن برساہے نہ ان کی مشکل آسان ہوئی۔ اسلام جب دین رحمت بن کر آیا تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد ساہوکاروں کے چنگل میں سسک رہی تھی جو اپنی مجبوریوں کے باعث ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ انسان کو دو وقت کی روٹی میسر نہ ہو تو بنیادی قدروں حتی کہ دین و ایمان کی سلامتی کی بھی کوئی ضمانت نہیں رہ جاتی۔ دین فطرت نے انسان کی اس فطری کمزوری کے علاج کے طور پر شروع دن سے صدقات و خیرات کو فروغ دینے کے لئے عملی اقدامات کیے۔ اس راہ پر چلنے والوں کا حوصلہ بڑھایا اور ان کی عزت افزائی کی۔ ساتھ ہی سود کی علت سے لوگوں کو بچانے کے لئے اقدامات بھی جاری رکھے۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۲۷۰ سے ۲۷۵ تک غریبوں اور ناداروں کی حالت کی ایک دلنشین تصویر پیش کی گئی ہے۔ اسی موقع پر سود کی خرابیوں اور سود خوری کے انجام کا ذکر بھی آیا ہے۔ پھر ارشاد ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ ط (۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے سود کو اور فروغ دیتا ہے صدقات کو،

بالآخر اسلامی تعلیمات جب آخری اور حتمی شکل اختیار کر رہی تھیں تو سن ۸ ہجری میں ادھر سودی نظام کی مکمل بیخ کنی ہوئی تواُدھر نظامِ زکوٰۃ کو ایک واضح شکل دے کر اور ایک مقررہ مالی حد یا اس سے زائد پر ایک مقررہ مقدار طے کر دینے کے بعد باقاعدہ طور پر اسے نافذ کر دیا گیا۔ بغور دیکھا جائے تو رسولِ مکرم ﷺ نے ہر چیز کو بہت عمدگی سے واضح فرما دیا تھا۔ کسی طرح کا کوئی ابہام یا خفاء و اشکال حتّٰی کہ اجمال بھی باقی نہیں چھوڑا تھا۔ قرآن حکیم کی جملہ نصوص صریح و واضح اور جامع و مانع ہیں۔ مگر ہمارے بڑوں سے ایک بہت بڑی غلطی یہ بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے خود کو مختلف فقہی مذاہب کے حصار میں قید کر لیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے خود پر لازم کر لیا تھا اور خود کو اس امر کا مکلف بنا لیا تھا کہ بہر طور اپنے فقہی مذہب کو ہی حق ثابت کرنا ہے اور اسی کی بالادستی کے قیام کے لیے ہی ساری عمر کوششیں کرنی ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے اس خود ساختہ عہد کی لاج بھی رکھی۔ اس اثناء میں دین کی عظمت و ساکھ کا بہت نقصان ہوا ہے۔ نصوص کی تعبیرات کے معاملے میں بے احتیاطی کی انتہاء یہ ہے کہ امام شافعی اگر کوئی موٴقف اختیار کرتے ہیں تو فخر الدین رازی جیسا بڑا اور چوٹی کا مفسر اپنے اوپر یہ فرض عائد کر لیتا ہے کہ اس موٴقف کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں ہر قیمت پر درست ثابت کرنا ہے۔ عہدِ تعبیر و تشریح کے پورے طول و عرض پر اس رجحان کا غلبہ اور بالادستی قائم بھی رہی ہے۔ ایسے جذبات کے زیر اثر کی گئی تعبیر و تشریح کو آنکھیں بند کر کے بطورِ حق و صدق قبول کر لینا یقیناً خطرہ سے خالی ہرگز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کسی وجہ سے امام شافعیؒ کو قرآن حکیم کی ایک بہت ہی صریح اور واضح نص میں خواہ مخواہ اجمال نظر پڑتا ہے۔ اس کی لاج رکھتے ہوئے فخر الدین رازی متذکرہ آیہ کریمہ کے ذیل میں اپنی تفسیر کا رخ امام شافعیؒ کی تائید و حمایت کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ حالانکہ حق یہ تھا کہ رازی کی نظر قرآن حکیم کی نصوص پر امام شافعی کی نظر کے مقابلے میں بہت گہری تھی۔ کیونکہ ان کا یہ شعبہ اختصاص ہے۔ ان پر لازم تھا کہ اجمال کے قول کی نفی کرتے ہوئے درست تعبیر پیش کرتے اور شوافع سمیت جملہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہوتی کہ ایک دیدہ وَر شخص کی بتائی ہوئی بات پر پہرا دیتے تاآنکہ اللہ تعالیٰ کسی اَور انداز سے ان کے اوپر بصیرت کے در وا کر دیتا۔ تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی لکھتے ہیں :

> مَذْهَبُ الشَّافِعِي رضي الله عنه اَنَّ قَوْلَهُ: ''وَاَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا'' مِنَ الْمُجْمَلَاتِ الَّتِيْ لَا يَجُوْزُ التَّمَسُّکُ بِهَا، وَهٰذَا هُوَ الْمُخْتَارُ عِنْدِیْ۔(۲)

> ترجمہ: شافعی رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ قول: ''وَاَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا'' بھی ان آیات میں شامل ہے جو کہ مجمل وارد ہوئی ہیں، جن سے وابستہ ہونا جائز ہی نہیں ہے۔ اور یہی بات میں نے بھی اختیار کر لی ہے۔

اس آیہ کریمہ کے ان کلمات سے قبل وارد ہونے والے ان کے تمہیدی کلمات ''ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا'' (البقرہ:۲۷۵)، یعنی: ''اس پورے معاملہ کا باعث یہ ہوا ہے کہ انہوں نے یہ موٴقف اختیار کر لیا ہے کہ ''اس دعوے کی قلعی کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ آیہ کریمہ کا یہ حصہ ''قَالُوْا'' کے ''مَقُوْلَه''، ''اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا'' کا حال واقع ہو رہا ہے۔ ''وَ'' بیانِ حالت کے لیے وارد ہوئی۔ اس قول کے قائلین سود خور ہیں اور سود خوری پر اڑے ہوئے ہیں۔ سود خوری کو بھی خرید و فروخت کی طرح کا ہی ایک معاملہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ ان کی یہ بات دُہرا کر قرآن حکیم میں بیان کر دی جاتی ہے تا کہ اس قول کے قائلین کی کم عقلی و نادانی کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے اور دانشِ اہل عرب میں کسی کی کم عقلی و نادانی کا اگر یوں پول کھل جایا کرتا تھا تو آسان لفظوں میں اُس کے لیے

ڈوب مرنے کا مقام ہوا کرتا تھا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم نے دانش و بصیرت کے میدان میں ان کو چت کر دیا اور خلقِ خدا اس عمل کا مشاہدہ و نظارہ بھی کرتی رہی۔ حتی کہ پھر وہ لوگ آگے کچھ بولنے اور کہنے کے ہی قابل نہ رہے تھے۔ فرمانِ باری تعالیٰ بکمالہ حسبِ ذیل ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبَا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۷)

ترجمہ: وہ لوگ جو سود خور ہیں اپنے پاؤں پہ کھڑے ہی نہیں ہو پاتے الا یہ کہ کسی ایسے شخص کی مانند جس کو شیطان نے مس کر کے مخبوط الحواس بنا دیا ہو، اس پورے معاملہ کا باعث یہ ہوا ہے کہ انہوں نے یہ موقف اختیار کر لیا ہے کہ سود بھی پورے کا پورا خرید و فروخت ہی کی مثل ہے، حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کے عمل کو تو جائز و حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دے دیا ہے، تو جس کسی کے پاس اس کے رب کا وعظ و نصیحت پہنچے اور وہ باز آجائے تو اُس کا پچھلا کیا کرایا سب معاف ہے، اور اس کا معاملہ بس اللہ ہی کے سپرد ہے، اور جو لوگ سر کھول کریں گے تو وہی لوگ آگ والے ہوں گے، یہ لوگ اسی میں پڑے رہیں گے ہمیشہ۔

کلمات اور فقروں کی ترتیب، ترکیب اور بندش ہی ایسی ہے کہ نہ کوئی ابہام پیدا ہوتا ہے نہ کسی طرح کا اجمال کہ اس کی تفصیل کے ورود کا انتظار کیا جائے۔ سود خور اپنے زعم میں ایک اصول وضع کرتے ہیں کہ "خرید و فروخت اور سود کا لین دین دونوں ایک جیسے معاملات ہی تو ہیں"۔ پھر اُن کی کم عقلی کی انتہاء ہی ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں دیکھو تو "حالت یہ ہو گئی ہے کہ اللہ نے خرید و فروخت کے عمل کو تو جائز و حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دے دیا ہے"۔ ان حالات میں اُن کو سزا دینے کا سب سے عمدہ اور بہترین طریقہ یہی تھا کہ اُن کی ذہنی و عقلی حالت سب کے سامنے نمایاں کر کے رکھ دی جاتی۔ اور یہی عمل ہوا بھی ہے۔ جار اللہ زمخشری کو کسی طرح کا کوئی اجمال نظر ہی نہیں پڑتا۔ وجہ شائد یہ ہو کہ آپ شافعی مذہب کے پیروکار نہیں ہیں۔ کلمات: "وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا" کی وضاحت و تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِنْکَارٌ لِتَسْوِیَتِهِمْ بَیْنَهُمَا۔ وَ دَلَالَةٌ عَلٰی اَنَّ الْقِیَاسَ یَهْدِمُهُ النَّصُّ۔ لِاَنَّهٗ جَعَلَ الدَّلِیْلَ عَلٰی بُطْلَانِ قِیَاسِهِمْ اِحْلَالَ اللّٰهِ وَ تَحْرِیْمَهٗ۔ (۸)

ترجمہ: یہ کلمات ان لوگوں کی جانب سے خرید و فروخت اور سودی لین دین کے معاملات کو ایک سا بتانے کے خلاف بطورِ انکار وارد ہوئے ہیں۔ اور اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ قیاس کو نص ملیامیٹ کر دیا کرتی ہے۔ بایں طور کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے خرید و فروخت کی حلت اور سود خوری کی حرمت کے تعلق سے ان کے قیاس کے بطلان پر ان کلمات کو دلیل بنایا ہے۔

مگر حق بات یہ ہے کہ یہ فقرہ بھی سود خوروں نے قرآنی احکامات کو بے وزن بتانے کی خاطر ہی استعمال کیا تھا۔ جیسا کہ کلمات اور عبارت کے تسلسل سے ہی یہ بات پوری طرح سے عیاں ہے۔ اور چونکہ انہوں نے یہ سب کچھ اپنی بد باطنی اور بد دماغی کے باعث کیا تھا اس لیے خلقِ خدا کے سامنے اُن کی ذہنی و عقلی اوقات واضح کر دی گئی ہے اور وہ لوگ پھر کچھ اَور کہنے کے قابل ہی نہیں رہے ہیں۔ یونہی حکمت و دانش قرآن کے ہاتھوں ان کو ہر کہیں منہ کی ہی کھانی پڑی ہے۔ اور پول کھلتے جاتے تھے تو وہ لوگ بے بسی کی تصویر بنتے جاتے تھے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ سابق تعبیر و تشریح پر اس نوعیت کے سائے بہت گہرے ہیں۔ اور یہ باتیں چونکہ پرانے وقتوں سے یونہی چلی آئی ہیں اس لیے ہم بھی ان سے تقریباً پوری طرح سے مانوس ہو چکے ہیں۔ اور معاملات اگر جوں کے توں ہی رہتے ہیں تو ہمارے لیے عمل کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی رہیں گی۔ مگر اصلاحِ احوال کی کوششوں کے لیے بھی لازم ہے کہ معاملہ فہمی و بصیرت اور حقائق پر مبنی ہی ہوں بصورتِ دیگر ماضی سے سبق نہ سیکھنے والی بات ہی ہو گی۔

قرآن حکیم نے اس امر کو بھی پوری طرح سے واضح فرمادیا ہے کہ سود اور زکوٰۃ کے مابین ایک رشتہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ کا نظام سودی نظام کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ لینے کے لیے ہی وضع ہوا ہے۔ اس لیے بنیادی اور اصولی بات ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے تناظر میں رکھ کر ہی دیکھنا چاہئے اور صرف اسی صورت میں دونوں کو سمجھا بھی جا سکتا ہے۔ نظام زکوٰۃ گہرے طور پر متاثر ہو گا اگر سود کے معاملات میں ابہام پیدا ہوا۔ اور سود کی حقیقت کبھی واضح نہ ہو سکے گی اگر نظامِ زکوٰۃ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو سمجھنے کی کوئی کوشش ہوئی۔ اور سودی معاملات کے بارے میں ہمارے اصولی نظریات کے اندر بھی بہت سی الجھنیں موجود ہیں۔ فخر الدین رازی ہی کا بیان ملاحظہ کیجیے۔ روایت بیان کرتے ہیں:

رَوٰی اَحْمَدُ وَ ابْنُ مَاجَه عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مِنَ الدُّنْیَا وَ مَا سَأَلْنَاهُ عَنِ الرِّبَا۔ (۹)

ترجمہ: احمد بن حنبل اور یزید ابن ماجہ کی روایت ہے سیدنا عمرؓ سے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور ہم نے آپ ﷺ سے سود کی بابت تفصیلات دریافت نہیں کی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان وقتوں کی روایت ہے جب کوئی سا بھی مؤقف اپنا لینے والوں کو بکثرت روایات کی تائید مل جایا کرتی تھی۔ ورنہ سود کے معاملات میں بھی قرآن حکیم نے کسی طرح کا کوئی ابہام نہیں چھوڑا ہے۔ ہاں البتہ ایک خبر واحد کی بنیاد پر ناپ اور تول کے تحت روزمرہ میں خریدی اور بیچی جانے والی چھ اشیاء کے معاملے میں کچھ مشکلات ضرور درپیش ہیں۔ مثال کے طور پر ربا الحدیث کی مزاحمت کے پاس فقہاء کو یہ مؤقف اختیار کرنا پڑا ہے کہ ایسے چاندی سے بنے ہوئے سکے جس میں میل شامل ہو، اگر پانچ سکے بطورِ زکوٰۃ واجب الاداء ہوں گے اور کوئی شخص ان کی جگہ اگر چار کھرے و خالص سکے اداء کرے گا تو قیمتاً زائد ہونے کے باوجود یہ معاملہ جائز نہیں ہو گا۔ ایسی صورت میں فقط چار ہی کی ادائیگی تسلیم ہو گی اور پانچواں درہم بدستور واجب الاداء ہی رہے گا۔ البتہ جہاں یا جن اشیاء میں ناپ یا تول کر خرید و فروخت نہیں ہوتی وہاں ایسا عمل جائز متصور ہو گا۔ جیسے چار درمیانی جسامت کی بکریوں کی جگہ اگر کوئی شخص تین صحت مند، موٹی تازی اور بھری پری بکریوں کی لگام دے دیتا ہے تو یہ جائز ہو گا۔ (۱۰)

لہٰذا بر تقدیرِ صحت ہمیں مندرجہ ذیل روایت کی حقیقی رمز بہر طور سمجھنی ہو گی۔ یہ واضح رہے کہ ربا القرآن کا معاملہ بہت ہی واضح ہے۔ اور ربا القرآن کے مقابلے پر ربا الحدیث پر مبنی تصور دراصل اسی روایت کی بنیاد پر قائم ہے۔ قرآن حکیم سے اس کو کسی طرح کی تائید نہیں ملتی۔ حضرت عبادۃ ابن الصامتؓ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَ الفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَ الْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَ الشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ، وَ التَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَ الْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مَثَلاً بِمَثَلٍ، سَوَآءً بِسَوَآءٍ، يَدًا بِيَدٍ۔ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔ (۱۱)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: سونے کا سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے، گندم کو گندم کے بدلے، جو کو جو کے بدلے، کھجور کو کھجور کے بدلے اور نمک کو نمک کے بدلے خرید و فروخت کا معاملہ ہو تو ویسی کی ویسی، برابر سرابر، اور ہاتھ کے ہاتھ کا معاملہ ہی ہونا چاہیے۔ تو جب ان اصناف میں باہمی اختلاف ہو تو ہاتھ کے ہاتھ کا معاملہ ہو تو جیسے چاہے بیچو۔

اس نوع کی روایات کے باعث معاشرتی تعاملات میں کئی طرح کی دقتیں پیدا ہوئیں اور دشواریاں حائل ہو گئی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آئمہ مجتہدین نے اپنے اپنے طور اس ممانعت و حرمت کی جو جو علتیں بیان کی ہیں ان پر توجہ کی جائے تو ایک شے کا لین دین ایک امام کے نزدیک جائز و حلال ہے تو اسی حال میں دوسرے امام کے نزدیک یہی لین دین قطعی ناجائز و حرام قرار پایا ہے۔ یہ فرق کوئی معمولی نوعیت کا نہیں حرام اور حلال کا معاملہ ہے۔ اس کا لوگوں پر ایک نفسیاتی اثر یہ بھی پڑتا ہے کہ حرام و حلال کی بنیادی قدریں بے توقیر ہو جاتی ہیں۔ لوگ پھر ان کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ دراصل ربوا الحدیث قطعی جداگانہ نوعیت کی شے ہے۔ ربوا القرآن سے اسے کوئی نسبت و تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا تو اِس کے اوپر سایہ تک پڑتا دکھائی نہیں دیتا۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی جس ربوا کا ذکر ہے وہ ربوا القرآن یا معروف معنوں میں عربوں میں رائج رہنے والا سود ہی ہے۔ ابن ہشام خطبۂ حجۃ الوداع کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

اِنَّ كُلَّ رِبَا مَوْضُوْعٌ لٰكِنْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ قَضَى اللهُ اَنَّهٗ لَا رِبَا۔ وَ اِنَّ رِبَا عَبَّاسِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ۔ (۱۲)

ترجمہ: بلاشبہ تمامی سود متروک ہو چکا ہے البتہ تمہارے رؤس الاموال محفوظ ہیں۔ نہ تم کسی پر ظلم کا ارتکاب کرتے ہو نہ ہی کسی کو اپنے اوپر ظلم کرنے دیتے ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے طے فرما دیا ہے کہ سود کا نظام باطل ہے۔ اور بلاشبہ عباس بن عبد المطلب کا تمام کا تمام سود چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہ جس ربوا کا ذکر ہے یہ ربوا القرآن ہی ہے۔ ربوا الحدیث طرز کی کسی شے کا وجود ہوتا تو یہ اہم موقع تھا اس کو بیان و واضح کرنے کا کیونکہ یہ اس کا معرضِ بیان ہے۔ ایک کا ذکر ہو اور دوسرے کا ذکر نہ ہو۔ یہ بعید از قیاس ہے۔ اسی طرح خطبۂ حجۃ الوداع سے پہلے سن ۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں تو عہدِ

جاہلیت کی ناجائز مال خوری جس کا سب سے واضح اور بڑا ذریعہ یہی ربا الجاہلیت ہی تھا، اس کو واضح الفاظ میں باطل قرار دیتے ہیں۔ ابن ہشام ہی راوی ہیں :

اَلَا کُلُّ مَاثُرَۃٍ اَو دَمٍ اَوْ مَالٍ یُدَّعٰی فَھُوَ تَحْتَ قَدَمَیَّ ھَاتَیْنِ (۱۳)

خبر دار! یہ بات کسی کے دھیان و حافظہ سے اترنے نہ پائے کہ ہر طرح کی خاندانی و موروثی عزت و بلند مقامی یا ہر طرح کی خون آشامی یا ہر طرح کی ناجائز مال خوری، جس جس کا بھی جاہلیت کے اطوار کے تحت دعویٰ کیا جاتا رہا ہے، تو ایسا ہر دعویٰ میرے ان دو پاؤں کے نیچے ہے، پامال و کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

مسلم بن حجاج القشیری نے ''باب بیع الطعام مثلاً بمثل'' میں ایک روایت درج کی ہے۔ اس روایت میں مزعومہ ربوا الحدیث کی بابت صحابہ کرام کا مکالمہ درج ہے۔ وہ یوں کہ راوی ابو صالح کہتے ہیں: میں نے ابو سعید خدری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''دینار کے بدلے دینار اور درہم کے بدلے درہم کا سودا ہو تو برابر سرابر۔ جو بڑھائے گا یا بڑھوتری کا طلبگار ہو گا وہ سود خوری کا مرتکب ہو گا''۔ تو میں نے ان سے کہا: ''ابنِ عباس تو کچھ اَور ہی کہتے ہیں''۔ پھر انہوں نے بتایا کہ '' ابنِ عباس سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا ہے کہ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ سود بس قرض کے معاملات میں ہی ہوتا ہے، اس کی بابت کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ سُنا ہے؟ یا یہ کہ آپ کو کتاب اللہ میں کچھ نظر آیا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ نہ تو ایسا کچھ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اور نہ مجھے ایسا کچھ کتاب اللہ میں ملا ہے۔ تاہم اسامہ بن زید بتاتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''اَلرِّبَا فِی النَّسِیْئَۃِ''۔ یعنی: ''سودی معاملہ بس اُدھار کے معاملات میں ہی ہوتا ہے''۔ (۱۴)

اس روایت سے اتنا تو ضرور واضح ہو ہی جاتا ہے کہ خود عہدِ رسالت مآب ﷺ میں بھی ان متذکرہ چھ چیزوں میں سے کسی کو اُسی کی جنس کے بدلے خریدنے یا بیچنے کے معاملات میں سود خوری کے الزام کا معاملہ پوری طرح سے مشہور و متعارف نہیں تھا۔ حضرت ابنِ عباس جیسے بہت ہی قربت رکھنے والے صحابی کا اس سے پوری طرح سے بے خبر ہی رہنا اور ایسی سوچ کا سرے سے قائل ہی نہ ہونا آخری کیا معنی دیتا ہے؟ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ عہدِ رسالت کے بعد کے وقتوں میں ہی اس موقف کو فروغ دیا گیا ہے۔ پھر اس کو بڑھا چڑھا کر ربوا الحدیث کا نام دیا گیا اور پھر اس کو قرآنِ حکیم کے نظریۂ ربوا کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا کسی بھی طرح سے ممکن یا مناسب نظر نہیں آتا کہ اتنی کمزور بنیادوں پر استوار اس سوچ کو بھی قرآن حکیم کے نظریۂ سود کے ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔ بلکہ آنے والے وقتوں میں اس مزعومہ سود کے تعلق سے تعیین علل کے معاملے آئمہ مجتہدین کے اجتہادات اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ ہمارے بے رحمانہ برتاؤ اور قوم کو تقسیم کرنے کی غیر محتاط کوششوں کی شہادت ہی دیں گے۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ مبادلہ اشیاء بالاشیاء کی حوصلہ شکنی ہی ہو سکتی ہے۔ مگر اس حکم پر بھی عہدِ رسالت مآب ﷺ میں بہت زیادہ زور دینے یا زیادہ سے زیادہ تشہیر کرنے کا کم سے کم کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ زمانوں سے جو ایک جمود طاری تھا مقامی ماحول اور لوگوں کے مزاجوں میں کہ زرِ نقد کی طرف دھیان دینے یا خرید و فروخت کے لیے بازاروں کا رخ کرنے کی بجائے چیز کے بدلے چیز کی خرید و فروخت کو آسان سمجھتے تھے۔ ایک صحابی جب خیبر سے اموال کے ساتھ آئے تو بہت عمدہ کھجوریں دیکھ کر آپ ﷺ

نے دریافت فرمایا کہ کیا خیبر کی سبھی کھجوریں ایسی ہی عمدہ قسم کی ہوتی ہیں۔ صحابی نے کہا: یارسول اللہ! ہم دو صاع برابر عام کھجور کے بدلے ایک صاع اچھی نسل کی کھجور لے لیتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ، ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا''۔ (۱۵)

یعنی: '' ان کھجوروں کو دراہم کے بدلے فروخت کرواور پھر دراہم کے بدلے جنیب کھجور خرید لو''۔ لگتا ہے کہ ریاستِ مدینہ ایک ایسی نہج تک آپہنچی تھی جہاں اس کو مبادلہ اشیاء بالاشیاء کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے اپنے بازاروں اور زرِ نقد کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔ لہٰذا زمانوں سے جمے ہوئے جمود کو ختم کرنے کے لیے اور مقامی طور پر تجارت اور کرنسی سسٹم کو عملاً رائج اور نافذ کرنے اور فروغ دینے کے لیے عارضی و عبوری طور پر ہی یہ اقدامات اٹھائے گئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے سونے کی ایسی ڈلی جس میں آدھی میل شامل ہو خالص اور کھرے سونے کی اتنی ہی مقدار کے بدلے میں کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ پھر یہ بھی طے کرنا ان وقتوں میں یقیناً بہت دشوار رہا ہو گا کہ سونے کے اندر کتنے فیصدی میل کا حصہ ہے۔ جھگڑے اور تنازعات کو خواہ مخواہ راستہ ملنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ لامحالہ بازار میں اس کے جو بھی دام لگیں بیچ کر ان داموں دوسری شے خرید لی جائے تو جھگڑے کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔ بہر نوع ربا الحدیث کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کا زمانوں کے لیے عملی نفاذ ممکن بنایا جاسکے۔ اس لیے اصولی طور پر اس کو ربوا القرآن جو کہ حقیقت میں ربوا ہے کے ساتھ مزاحم نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی کسی طرح سے ربوا القرآن کی بنیاد میں اس کے باعث کوئی خلل پیدا کرنے کی سعی کسی طرح سے مناسب ہو گی۔ عہدِ جاہلیت میں لوگوں کا تعامل زمانوں تک سودی لین دین پر رہا تھا۔ اس لیے وہ لوگ بخوبی واقف تھے کہ سود کیا ہوتا ہے۔ رازی عہدِ جاہلیت میں روا رکھے گئے سود کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اَمَّا رِبَا النَّسِيْئَةِ فَهُوَ الْاَمْرُ الَّذِیْ كَانَ مَشْهُوْرًا مُتَعَارَفًا فِی الْجَاهِلِيَّةِ۔ وَ ذٰلِكَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَدْفَعُوْنَ الْمَالَ عَلٰی اَنْ يَّاْخُذُوْا كُلَّ شَهْرٍ قَدْرًا مُعَيَّنًا۔ وَيَكُوْنُ رَاْسُ الْمَالِ بَاقِيًا۔ ثُمَّ اِذَا حَلَّ الدَّيْنُ طَالَبُوا الْمَدْيُوْنَ بِرَاْسِ الْمَالِ۔ فَاِنْ تَعَذَّرَ عَلَيْهِ الْاَدَآئُ، زَادُوْا فِی الْحَقِّ وَ الْاَجَلِ۔ فَهٰذَا هُوَ الرِّبَا الَّذِیْ كَانُوْا فِی الْجَاهِلِيَّةِ يَتَعَامَلُوْنَ بِهٖ۔ (۱۶)
>
> ترجمہ: رہا معاملہ قرض وادھار پر سود کا تو یہ ایسا معاملہ تھا کہ عہدِ جاہلی میں بہت مشہور و متعارف تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اس شرط پر کسی کو مال کی ایک مقدار دیا کرتے تھے کہ ہر ماہ اس پر وہ ایک طے شدہ مقدار وصول کیا کریں گے۔ اور راس المال اپنی جگہ محفوظ رہے گا۔ پھر جب قرض کی مدت پوری ہو جاتی تھی تو مقروض سے راس المال کی ادائیگی کا تقاضا کیا کرتے تھے۔ اگر اس کے لیے ادائیگی کی کوئی صورت نہ بنتی تو قرض کی مدت اور اس پر سود کی مقدار بڑھا دیا کرتے تھے۔ تو یہ ہے وہ سود جس پر وہ لوگ عہدِ جاہلیت میں عمل پیرا تھے۔

ربوا القرآن کے معاملے میں بھی ہوا یہ ہے کہ آیاتِ ربوا کے واقعی اور تدریجی نزول کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ اب بنیادی اصول یہی کارآمد ہو سکتا ہے کہ نظمِ قرآنی پر گہرے غور وخوض سے یہ معلوم و متعین کیا جائے کہ کون سی آیات پہلے اور کون سی بعد میں نازل ہوئی ہیں۔ ان تمام آیات کو ایک ترتیبِ نزولی کے تحت لا کر معاملہ سلجھایا جاسکتا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں ہدف تو ایک ہی تھا اور وہ تھا سود خوری کو حرام قرار دینا۔ مگر زمانوں سے سودی کاروبار میں لگا ہوا سرمایہ یک بیک نکال کر سود

سے دست کشی کسی طور ممکن نہیں تھی۔ اسی طرح عربوں کا ایک بھاری سرمایہ غلاموں ور باندیوں پر بھی لگا ہوا تھا۔ اسلام نے غلامی کو خاتمہ کی راہ پر ڈال کر چھوڑ دیا تھا تاکہ فوری خاتمہ کے باعث لوگوں کا بھاری سرمایہ ڈوب جانے سے پہنچنے والے غیر معمولی نقصان سے لوگوں کو بچایا جاسکے۔ اس کے علاوہ لوگوں نے شراب بنا کر اسے ذخیرہ کر دینے پر بھی بہت بھاری سرمایہ لگا رکھا تھا۔ شراب کو بتدریج حرام قرار دے کر لوگوں کو اپنا لگا ہوا سرمایہ نکالنے کا پورا پورا موقع بھی دیا گیا ہے۔ حتّٰی کہ بعض رویات کے مطابق رسولِ کریم ﷺ نے بہت واضح الفاظ میں اس بات کا خود اظہار و اعلان تک فرما دیا تھا۔ حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یَخْطُبُ بِالْمَدِیْنَةِ۔ قَالَ: یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللهَ تَعَالٰی یُعَرِّضُ بِالْخَمْرِ ۔ وَ لَعَلَّ اللهَ سَیُنَزِّلُ فِیْهَا اَمْرًا۔ فَمَنْ کَانَ عِنْدَهٗ مِنْهَا شَیْئٌ فَلْیَبِعْهُ وَ لْیَنْتَفِعْ بِهٖ۔ (۱۷)

ترجمہ: میں نے مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! بلا شبہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شراب کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ اور توقع ہے کہ بہت جلد اللہ تعالیٰ اس معاملے میں کوئی بڑا اور واضح حکم نازل فرمادے گا۔ لہٰذا جس کسی کے پاس بھی اس کی کچھ مقدار پڑی ہو تو اُس کو چاہیے کہ اِس کو بیچ دے اور اِس سے نفع اندوز ہو لے۔

راوی نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ آپ ﷺ نے دوران خطبہ یہ ارشاد فرمایا تھا۔ یہ اس بات کی تشہیر کا سب سے موثر ذریعہ تھا۔ خراب بنیادوں پر معاملات اگر مدتِ مدید اور عرصہ بعید سے یونہی چلے آئے ہوں تو لوگوں کو محفوظ طریقے پر اپنا سرمایہ نکالنے کے لیے مہلت دینا رسولِ کریم ﷺ کی سنتِ مطہرہ اور اُسوۂ حسنہ ہے۔ ہم فی زمانہ اپنے معاملات میں بھی اسی کی پیروی کے پابند ہیں۔ سود کا معاملہ بھی پرانا تھا اور اس کے لیے خاصا وقت درکار تھا تاکہ لوگ محفوظ طریقوں سے اپنا سرمایہ واپس اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ بصورت دیگر سرمایہ ڈوب جاتا اور ریاست مدینہ کی مالی و اقتصادی حالت بھی تباہی کے دھانے پر پہنچ جاتی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ کسی بھی کاروبار میں لگا ہوا سرمایہ نکالنے کا انتہائی اقدام چھوٹی موٹی باتوں سے متاثر ہو کر کوئی نہیں کیا کرتا۔ اس لیے لازم ہے کہ لوگوں کا ذہن صاف کر دیا گیا ہو گا کہ سودی نظام کا خاتمہ یقینی ہے۔ اور یہ کہ سود کو بہت جلد حرام قرار دے دیا جائے گا اور ریاستِ مدینہ اور اس کی حدود میں سودی کاروبار اس ضابطے کے عملی نفاذ کے بعد ممکن نہیں رہے گا۔ ان تمامی امور پر آیاتِ قرآنیہ کے نظم سے ہی رہنمائی لینی ہو گی۔

کسی ایک معاملے کی شروعات سے انتہاء تک لے جانے والے احکامات میں ایک قدرتی تسلسل کلامی رہنمائی کے لیے موجود رہتا ہے۔ چنانچہ کچھ آیات کا نظم واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا نزول حرمتِ ربوا کے قطعی حکم سے پہلے ہوا ہے۔ اور ان سے مقصود یہ تھا کہ لوگ اس حتمی حکم کی تاب لانے کے لیے ذہنی و عملی طور پر خود کو تیار کر لیں۔ اور نئے ضابطے کے اجراء اور عملی نفاذ کے لیے لوگوں کے معمولات اور ماحول پوری طرح سے سازگار ہو جائے۔ ان وقتوں میں ان احکامات کا یقینی طور پر دور رس اثر ہوا ہو گا۔ اور ولوگوں نے سودی کاروبار سے اپنا سرمایہ نکالنے اور محفوظ بنانے کے لیے ممکن حد تک تیز رفتاری کے ساتھ اقدامات بھی کیے ہوں گے۔ ان تمامی امور پر حسبِ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ سے روشنی پڑتی ہے :

یَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ وَاللهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ (۱۸)

ترجمہ: اللہ کا نظام سود کا خاتمہ کرتا اور نظامِ صدقات کو فروغ دیتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار سے محبت نہیں رکھتا۔

''یَمْحَقُ'' بمعنی: ''مٹانا'' اور ''یُرْبِیْ'' بمعنی: ''فروغ دینا''، دونوں ''مضارع'' کے صیغے ہیں۔ فعل مضارع استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔ تو یقینی طور پر یہ آیہ مبارکہ ایسے وقتوں میں نازل ہوئی ہے جب سودی نظام کے خاتمہ اور نظامِ زکوٰۃ کے فروغ کے لیے کچھ واضح اور ٹھوس عملی اقدامات اُٹھائے جارہے ہوں گے۔ اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اِن اقدامات کا تسلسل جاری وساری رہا ہو گا۔ اسی اثناء میں سود خوری کو اللہ کی نافرمانی اور یہود کی دیرینہ روایت وخصلت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللهِ كَثِیْراً۔ وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰافِرِیْنَ مِنْهُمْ عَذَاباً اَلِیْمًا (۱۹)

ترجمہ: تو ان کے ظلم وناجائز تصرفات کے باعث ہم نے ان کے اوپر وہ پاک وطیب چیزیں بھی حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں، اور دوسروں کو بکثرت اللہ کے راستے سے روکنے کے ان کے عمل کی پاداش میں بھی۔ اور ان کے سود خوری کرتے رہنے کی پاداش میں بھی حالانکہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا، اور لوگوں کے اموال باطل طریقے پر کھانے کا اُن کا عمل بھی اس حکم کی بنیاد بنا ہے، اور ہم نے ان میں کے جملہ منکرین کے لیے دردناک عذاب تیار کر لیا ہے۔

یہود کی جانب سے دینی امور ومعاملات میں کیے گئے ناجائز تصرفات کے باعث اللہ پاک نے ان کو اپنی پاکیزہ نعمتوں سے محرومی کی سزا دی تھی۔ سود خوری تو یہودِ مدینہ کا طرۂ امتیاز بنا ہوا تھا۔ اور اہلِ کتاب میں سے بطورِ خاص یہودِ مدینہ کی بیماری مذہبی ذہنیت لوگ عاجز وتنفر چلے آرہے تھے۔ ایسے میں سود خوری کی ان کی پرانی عادت کو بھی نمایاں کرنے سے اس علت سے تنفر کا پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ اگلے مرحلے میں فقط سودِ مرکب کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ مگر سود مفرد ابھی جاری ہی رہتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰا اَضْعَافاً مُّضٰاعَفَةً وَّاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲۰)

ترجمہ: اے ایمان والو! بڑھا چڑھا کر تم لوگ سود مت کھاؤ، اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح یاب ہو جاؤ۔

اس آیہ کریمہ کے اندر لفظی صراحتیں موجود ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے سودِ مرکب ہی کی ممانعت مقصود تھی۔ لوگوں کا یہ اصرار کسی طور درست نہیں ہے کہ من حیث الکل سود کی ممانعت مقصود ہے۔ بلکہ یہ تدریجی طور پر سود کی ممانعت و حرمت کے مراحل میں سے ایک اہم مرحلہ ہے جب اس علت کے مکمل خاتمہ کے لیے عملی اقدامات شروع فرما دیئے گئے تھے۔

دراصل سود کی یہی بدترین شکل بھی تھی جو کہ معاشرے کے لیے تباہ کن حالات واثرات پیدا کرنے کی موجب تھی۔ اس میں ساہوکاروں کا سرمایہ بہت تیزی سے بڑھتا تھا اور بہت جلد اصل زر سے بھی کئی گنا زائد ہو جاتا جس کی ادائیگی محال ہو جاتی اور لوگوں کی عزتیں تک داؤ پہ لگ جایا کرتی تھیں۔ اس کے بعد ہی یعنی جب اس اصول کی جڑیں راسخ ہو چکی تھی تب جا کر اگلے مرحلے میں سودِ مفرد کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی پچھلے جملہ سودی معاملات پر بھی خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم لوگ ڈرتے رہو اللہ سے اور سود کی تمامی باقیات کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو تو۔ تو اگر تم لوگ باز نہ آئے تو سمجھو اللہ کے نظام اور اس کے رسول (ﷺ) کے خلاف اعلان جنگ کر رہے ہو، اور اگر تم لوگ سود خوری سے باز آجاتے ہو تو تمہارے رأس المال پر ہی تمہارا حق ہے، نہ تم ظلم کرو کسی پر نہ کوئی اَور تمہارے اوپر ظلم کا مرتکب ہو۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو ادائیگی کے لائق ہونے تک اسے مہلت دو، اور اگر تم صدقہ فرض کر لیتے ہو تو اگر جانو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔

جب کہ سود خوری کی ممانعت اور سودی نظام کے مکمل خاتمہ کے بعد جب اہلِ ایمان پوری طرح سے تباہ کن معاشرتی علت سے پوری طرح سے دست کش ہو چکتے ہیں تو بھی سود خوروں کی حجت بازی جاری رہتی ہے۔ چنانچہ ان کی حجت بازی کا ایک مکمل نقشہ اور اہلِ ایمان کو سودی لین دین پر مبنی طور طریقوں سے پوری طرح سے کنارہ کش ہی رہنے کی تاکید و تلقین پر مشتمل مفصل حکم حسبِ ذیل آیہ مبارکہ کے عمومی نظم سے ہی خوب عیاں ہے۔ ارشادِ ہے :

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۲)

ترجمہ: وہ لوگ جو سود خور ہیں اپنے پاؤں پہ کھڑے ہی نہیں ہو پاتے الا یہ کہ کسی ایسے شخص کی مانند جس کو شیطان نے مس کر کے مخبوط الحواس بنا دیا ہو، اس پورے معاملہ کا باعث یہ ہوا ہے کہ انہوں نے یہ موقف اختیار کر لیا ہے کہ سود بھی پورے کا پورا خرید و فروخت ہی کی مثل ہے، حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کے عمل کو تو جائز و حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دے دیا ہے، تو جس کسی کے پاس اس کے رب کا وعظ و نصیحت پہنچے اور وہ باز آجائے تو اُس کا پچھلا کیا کرایا سب معاف ہے، اور اس کا معاملہ بس اللہ ہی کے سپرد ہے، اور جو لوگ سر کھول کریں گے تو وہی لوگ آگ والے ہوں گے، یہ لوگ اسی میں پڑے رہیں گے ہمیشہ۔

سودی معیشت پر مبنی اس نظام کی جڑیں صدیوں سے غربت و افلاس کی نرم مٹی میں اپنی جگہ بناتی چلی آئی تھیں اور بہت گہری چلی گئی تھیں۔ لہٰذا جیسے کسی پودے کو کھینچ کر جڑوں سمیت نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو جڑوں کے کچھ نہ کچھ حصے ضرور ٹوٹ کر اندر مٹی میں ہی دفن ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح سود کی تمامی جڑوں کا بسلامت باہر نکل آنا بھی ناممکن اور ایک امرِ محال ہی تھا۔ سودی کاروبار میں لگا ہوا پورے کا پورا سرمایہ مدتی دور کے چند سالوں کے اندر واپس سمیٹ لینا ہر کسی کے بس میں بھی نہیں تھا۔ اور سودی نظام کا خاتمہ بھی بہت ضروری تھا۔ اس لیے پوری مہلت تو دی گئی مگر پھر بھی جو جڑیں اندر ہی رہ گئی تھیں ان کو چھوڑ دینے اور بھول جانے کا حکم ملا ہے۔ رأس المال یعنی سود پر لگا ہوا اصلِ زر بھی محفوظ ہو گیا ہے۔ قرآن حکیم نے اس کو بصراحت تمام تحفظ فراہم کر دیا ہے۔ اور مقروض اگر تنگ

دست ہے اور فوری طور پر قرض کی ادائیگی کر سکنے کے قابل نہیں ہے تو یہ بھی حکم مل گیا ہے کہ ان کو ادائیگی کے لائق ہو جانے دو اور ان کو مہلت دو۔ تمہارا بنیادی سرمایہ جتنا تم نے سودی کاروبار میں لگایا تھا وہ کہیں نہیں جاتا۔ پوری طرح سے محفوظ اور اگلے کے ذمہ واجب الاداء ہی رہے گا۔ یہ اصول بھی ساتھ ہی بیان کر دیا گیا ہے کہ ''نہ تم ظلم کرو کسی پر نہ کوئی اور تمہارے اوپر ظلم کا مرتکب ہو''۔ اور اگر آدمی کر سکے تو سود پر اُٹھائے ہوئے اس قرض کو صدقہ ہی سمجھ لے اور تنگ دستی کا لحاظ کرتے ہوئے رأس المال بھی معاف کر دے تو یقینی طور سے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی کا عمل ہو گا۔

اسلام نے ایک ہاتھ پہ سودی نظام کا مکمل خاتمہ کر دیا اور دوسرے ہی ہاتھ پہ صدقات کی ایک معین مقدار فرض قرار دے کر اسے ریاستی سرپرستی میں دے دیا ہے۔ اور غریب پروری کو ریاست کی ذمہ داری بنا کر ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اگر پورے نظام پر ایک گہری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھکاری پیدا کرنے رسم مٹا کر لوگوں کی دستگیری کی راہ پیدا کی ہے اور ان کو افلاس کی دلدل سے نکالنے کے لئے نہایت رحمدلانہ اقدامات تجویز بلکہ لازم فرمائے ہیں۔ صدقات و خیرات کی طرف دیکھتے رہنے اور سوال سے بچنے کے لئے آپ ﷺ نے محنت کی کمائی کھانے کی ترغیب اور تعلیم دی ہے۔ امام بخاری، کتاب الزکوٰۃ کے باب سوال سے پرہیز میں حضرت ابوہریرہؓ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں :

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَاَنْ یَّاْخُذَ اَحَدُکُمْ حَبْلَہٗ فَیَحْتَطِبَ عَلٰی ظَھْرِہٖ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّاْتِیَ رَجُلًا فَیَسْاَلَہٗ۔ اَعْطَاہُ اَوْ مَنَعَہٗ۔ (۲۳)

ترجمہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یقیناً تم میں سے اگر کوئی اپنی رسی پکڑے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیاں ڈھونے لگے تو یہ عمل اس سے بہتر ہے کہ کوئی کسی کے پاس جا کر سوال کرے۔ وہ دے یا نہ دے

۔

آپ ﷺ نے ایسی غریب پروری کی بجائے، جو غربت میں اضافہ کر دے، غریبوں، ناداروں اور مسکینوں کی دست گیری اور غربت کے خاتمے کا لائحہ عمل دیا ہے۔ اس راہ میں جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کی شکل میں امت کے لئے ایک خوبصورت اور ایمان افروز اسوۂ عمل بھی یادگار چھوڑا ہے۔ نظامِ زکوٰۃ کی اہمیت کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ زکوٰۃ کا درجہ نماز کے قریب رکھا گیا ہے۔ نماز بدنی عبادات میں سب سے اہم اور زکوٰۃ مالی عبادات میں اتنی ہی اہم ہے۔ زکوٰۃ کے معاملے میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اسلامی ریاست کے نظامِ مالیات کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور یہ صرف ریاست کا حق ہے، عہدِ نبوی میں ریاست ہی اسے وصول کرتی رہی ہے۔ عہد نبوی کے عُمال اور وُلَاۃ کی تفصیلات کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں جب اس کی ادائیگی سے انکار ہوا تو، بخاری کی کتاب الزکوٰۃ کے آغاز میں ہی روایت موجود ہے، آپؓ نے اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں خلیفۃ المسلمین ہونے کے ناطے منکرین زکوٰۃ کے خلاف اعلان جنگ فرما دیا تھا۔ آپؓ کا ارشاد ہے :

وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عَنَاقًا کَانُوْا یُؤَدُّوْنَھَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ لَقَاتَلْتُھُمْ عَلٰی مَنْعِھَا۔ (۲۴)

ترجمہ: اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ بکری کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی، جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے، دینے سے میرے سامنے انکار کریں گے تو اس انکار پر میں ان سے جنگ کروں گا۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کی رائے بھی اسی روایت کے تسلسل میں موجود ہے:

قَالَ عُمَرُ فَوَ اللهِ مَا هُوَ اِلَّا اَنْ شَرَحَ اللهُ صَدْرَ اَبِیْ بَکْرٍ رضی اللہ عنہ فَعَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۲۵)

ترجمہ: حضرت عمرؓ نے کر کہا: اللہ کی قسم! یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو بکرؓ کا سینہ کھول دیا ہے۔ تو میں بھی سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

آپؓ کی خلافت کے بعد جب ریاست میں ضعف آیا تو اس کی وصولی کی راہ میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان پیش آنے والی مشکلات کے باعث ریاست اسلامی اس کے مطالبہ سے دستبردار ضرور ہو گئی تھی مگر اس تصرف کا کوئی بھی شرعی جواز یا قابلِ قبول بنیاد موجود نہیں تھی۔ ابو عبیدہ لکھتے ہیں:

کَانَتِ الصَّدَقَةُ تُدْفَعُ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ اَوْ مَنْ اَمَرَ بِهٖ، وَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ اَوْ مَنْ اَمَرَ بِهٖ، وَ اِلٰی عُمَرَ اَوْ مَنْ اَمَرَ بِهٖ، فَلَمَّا قُتِلَ عُثْمَانُ اخْتَلَفُوْا۔ فَکَانَ مِنْهُمْ مَنْ یَدْفَعُهَا اِلَیْهِمْ۔ وَ مِنْهُمْ مَنْ یُقَسِّمُهَا۔ وَ کَانَ مِمَّنْ یَدْفَعُهَا اِلَیْهِمُ ابْنُ عُمَرَ۔ (۲۶)

ترجمہ: زکوٰۃ رسولِ مکرم ﷺ کے پاس جمع کروائی جاتی تھی یا اس شخص کے حوالے کی جاتی تھی جس کا آپ ﷺ زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے تقرر فرمایا کرتے تھے۔ اور بعد ازیں حضرت ابو بکرؓ کے پاس ہی جمع کروائی جاتی تھی، یا اس شخص کے حوالے کی جاتی تھی جس کا آپؓ زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے تقرر فرمایا کرتے تھے۔ بعد ازیں حضرت عمر کے پاس ہی جمع کروائی جاتی تھی، یا اس شخص کے حوالے کی جاتی تھی جس کا آپؓ زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے تقرر فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت عثمان کے قتل کا سانحہ رونما ہوا تو لوگ مختلف الرائے ہو گئے۔ پھر ان میں سے کچھ تو امراء کو ہی ادا کرتے رہے اور کچھ اپنے طور پر ہی تقسیم کرنے لگ گئے۔ جو لوگ امراء کے سپرد کیا کرتے تھے ان میں ابن عمر بھی شامل تھے۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

حَقُّ الْاَخْذِ کَانَ لِلْاِمَامِ فِی الْاَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ وَ الْبَاطِنَةِ لِظَاهِرِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی: ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ'' (التوبہ: ۱۰۳) وَ عَلٰی هٰذَا کَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَ الْخَلِیْفَتَانِ بَعْدَهٗ۔ فَلَمَّا وَلِیَ عُثْمَانُ وَ ظَهَرَ تَغَیُّرُ النَّاسِ کَرِهَ اَنْ یُفَتِّشَ الْعُمَّالُ مَسْتُوْرَ اَمْوَالِ النَّاسِ۔ فَفَوَّضَ الْاَمْوَالَ الْبَاطِنَةَ اِلٰی اَرْبَابِهَا نِیَابَةً عَنْهُ۔ (۲۷)

ترجمہ: فرمانِ باری تعالیٰ ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ'' سے حکمِ الٰہی کے صاف عیاں ہونے کے باعث اموال ظاہرہ و باطنہ پر زکوٰۃ کے معاملہ میں وصولی کا حق صرف امامِ وقت و فرمانروا کو ہی حاصل تھا۔ خود رسول اللہ

ﷺ بھی اپنی حیاتِ طیبہ میں اسی اصول پر قائم رہے ہیں۔اور آپ ﷺ کے بعد دونوں خلفاء کا بھی یہی دستور رہا ہے۔ پھر جب عثمان غنیؓ خلیفہ بنے اور لوگوں کے حالات متغیر ہو گئے تو اُن کو مناسب نہیں لگا کہ عمالِ سلطنت لوگوں کے اموال مستورہ کی کھوج کرید کیا کریں تو نئے حالات کے اس تقاضے کے پیشِ نظر آپؓ نے اموال باطنہ کا معاملہ اپنی نیابت کے ساتھ مالداروں ہی کے حوالے کر دیا تھا۔

ابو عبیدہ نے اپنی کتاب الاموال میں قومی خزانے میں زکوٰۃ نہ دینے والوں کے دلائل بھی سپردِ قلم کر دیئے ہیں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ان دلائل میں ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم ترین رکن کے معاملے میں اتنے بڑے تصرف کو قبول کر لینے اور اُسوہ مبارکہ کے تحت قائم ہونے والی ایک اہم روایت سے انحراف کے لیے ایک معقول بہانہ بن سکنے کی سکت اور جان بھی نہیں ہے۔(۲۸)

اللہ رب ذوالجلال کا ارشادِ پاک ہے:

فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ ط(۲۹)

ترجمہ: ایک فرض ہے اللہ کی طرف سے طے شدہ،

لہٰذا اصلاً ارکان اسلام میں سے زکوٰۃ ایک اہم ترین رکن اور فرائض میں سے اہم ترین فریضہ ہے۔ اور یہ رکن یا فریضہ اپنی حقیقی بنیاد سے محروم ہو جانے کے باعث انہی وقتوں سے معطل ہی چلا آرہا ہے۔ اس نکتہ ٔ نظر کے تحت ''زکوٰۃ'' کی شکل میں جو موجودہ اور مروجہ صدقہ دیا اور لیا جا رہا یہ دراصل محض صدقاتِ نافلہ میں سے ایک عمومی ''صدقہ و خیرات'' ہی کی ایک صورت ہے۔ جو ہر سال ادائیگی اور زکوٰۃ کے فرضی پیمانوں سے ناپ تول کے باعث زکوٰۃ ہی نظر آنے لگی ہے۔ اور لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہی زکوٰۃ ہے۔ لہٰذا اس کو صدقہ ٔ نافلہ کی کوئی شکل قرار دیا جائے تو اور بات ہو گی مگر یہ زکوٰۃ کا بدل ہر گز نہیں ہے۔ نہ ہی اس طرح سے وہ فرض ہمارے ذمہ سے ساقط ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے طے شدہ فرض قرار دیا ہے۔

حاصلِ کلام

دانشِ اہلِ عرب کی نمائندگی و ترجمانی کرتے ہوئے ''دُرَید بن صِمَّہ'' نے ایک اہم نکتے کی جانب متوجہ کیا ہے جسے نظر انداز کرنا اس عہدِ جدید میں بھی ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ کہتا ہے ؎

فَلَمَّا عَصَوْنِیْ کُنْتُ مِنْهُمْ وَ قَدْ اَرٰی ۔۔۔ وَ ایَتَهُمْ وَ اَنَّنِیْ غَیْرُ مُهْتَدٖ

اَمَرْتُهُمْ اَمْرِیْ بِمُنْعَرَجِ اللِّوٰی ۔۔۔ فَلَمْ یَسْتَبِیْنُوْا الرُّشْدَ اِلَّا ضُحٰی غَدٖ

وَ هَلْ اَنَا اِلَّا مِنْ غَزِیَّةِ اِنْ غَوَتْ ۔۔۔ غَوَیْتُ وَ اِنْ تَرْشُدْ غَزِیَّةُ اَرْشُدٖ (۳۰)

ترجمہ: ☆تو جب انہوں نے میری ایک نہ سنی تو میں بھی انہی میں سے ایک فرد ہی تو ہوں اور حالت یہ تھی کہ میں بس دیکھتا ہی چلے جا رہا تھا ان کی بد دماغی کو اور معاملہ میرا ابھی کچھ یوں تھا کہ میرے اوپر بھی کوئی یقینی و قطعی ہدایت نہیں اُتر آئی تھی۔

☆ میں نے ان لوگوں کو ''مُنعَرَجُ اللِّوٰی'' نامی پارلیمانی مشورہ گاہ میں اپنی رائے دی تھی، تو ان لوگوں نے اگلے روز چاشت کے وقت تک (جب ان پر وہ آفت اُتر آئی تھی) اپنے اوپر سمجھداری کی بات کے کھل کر نمایاں ہو جانے کی کوئی خواہش ہی نہیں رکھی تھی،

☆ اور میری حیثیت ہے کیا؟ سوائے اس کے کہ میں بھی اسی گروہ کا ہی ایک فرد ہوں، اگر یہ بد دماغ ہو گئے تو میں بھی بد دماغ ہو جاؤں گا، اور اگر یہ گروہ سُدھر گیا تو میں بھی ساتھ ہی سُدھر جاؤں گا۔

اسی نکتے کو شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بھی بہت خوبصورت لفظی جامہ پہنایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

لہٰذا ہر ایرا غیرا اگر قوم کے بنیادی اور اصولی معاملات میں دخیل ہو گا تو ملکی و قومی یک جہتی و ہم آہنگی، وحدت و جمعیت اور سالمیّت و وقار کو یقیناً صدمہ ہی پہنچے گا۔ یہ اصول بھی خود قرآنِ حکیم نے ہی دے رکھا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا جَآئَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِى الاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلاً (۳۱)

ترجمہ: اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ امن و خوشی یا کسی خوف کی کوئی خبر ان کو ملتی ہے تو معمولی جان کہ اس کی تشہیر کر دیتے ہیں، اور اگر ایسا ہوتا کہ رسولِ کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے کبار و اہل مشورہ صحابہ کے پاس پہنچا دیتے تو ان اولی الامر میں سے وہ اہل تجربہ و مہارت جو اس معاملے میں گہری بصیرت اور اخذ و استنباط کا ملکہ رکھتے ہیں ضرور اس معاملے کی تہ تک پہنچ جاتے، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بہت کم لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے ہی ہو لیتے۔

قرآن حکیم نے یہ اصول طے کر دیا ہے کہ ہر معاملے کی سمجھ ہر انسان کو نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی کہ اگر سمجھ حاصل نہیں ہے تو ان معاملات میں ایسے کسی شخص کو دخیل ہونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم کے اولین مخاطب حضرات صحابہ کرام ہی تو تھے۔ اگر ان کے معاملے قرآنِ حکیم کا لب و لہجہ یہ ہے تو کسی اَور کی یہاں کیا مجال ہے؟ چنانچہ قرار دے دیا گیا ہے کہ بصورتِ دیگر شیطان کی پیروی ہی کا عمل ہو گا۔ اس لیے قومی امور و معاملات کی زمامِ کار بہر حال ہمیں اپنے اہلِ فکر و دانش اور اصحابِ فہم و بصیرت کے ہاتھوں میں ہی دینی ہو گی۔ عام لوگ ان اصولی اور بنیادی معاملات میں اربابِ دانش و بصیرت کے طے کردہ طریق عمل کے معاملے میں فقط ساتھ ہی دیا کریں اور اتباع ہی کیا کریں۔ جواب طلبی کی جرأت نہیں۔ جب تک کہ وہ خود اپنے اندر بھی معاملہ فہمی اور دانش و بصیرت کا جوہر پیدا نہیں کر لیتے۔ جس کو یہ مقام نصیب ہو جاتا ہے، حجت بازی اس سے چھوٹ ہی جایا کرتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی رمز ہمیں مندرجۂ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ سے ہاتھ آتی ہے۔ ارشاد ہے:

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً (۳۲)

ترجمہ: اور جب جہلاء ان کو باتوں میں الجھانے کی کرتے ہیں تو اُن کو جواب دیتے ہیں کہ تم لوگ عافیت میں ہی رہو۔

یہ بات بھی اصولی ہے کہ انسان کو اللہ نے بہت شرف اور عزت سے نوازا ہے۔(۳۳) اس کے شایانِ شان نہیں ہے کہ خود کو حیوانیت کی سطح تک پست کر لے۔ اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ اور عقل و خرد سے بے نیاز رہ کر جینا اس کو کسی طور زیب نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ خام سے خالص کی جانب مسلسل سفر اور کشش اس کی فطرت میں ڈال دی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم نے تو بھیڑ چال اختیار کرنے پر پابندی بھی عائد کر رکھی ہے۔ اور بھیڑ چال ہے کیا؟ اپنے ہوشوں اور حواسوں، معاملہ فہمی و دانش سے بے نیازانہ کسی اَور کے پیچھے چلتے جانا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْؤُوْلًا۔(۳۴)

ترجمہ: اور جس معاملے میں تمہیں کمالِ علم نصیب نہیں تو یونہی کسی کے پیچھے مت چل پڑو، یقیناً قوتِ سماعت، قوتِ بصارت اور ان ذرائع علم سے حاصل معلومات کا کھرا کھوٹا الگ الگ کرنے اور تجزیہ و تحلیل کے عمل سے گزار کر ان سے حتمی اور واضح نتیجہ اخذ کرنے والی قوت، یہ سب اپنی اپنی ذات میں ایسے ہیں کہ ان سب سے پوری پوری جواب طلبی ہو گی۔

قَفَا، یَقْفُوْا، قَفْوًا، کا معنی ہے: ''پیروی کرنا''۔(۳۵) یعنی اپنی سمجھ کو کسی کام میں لائے بغیر یونہی کسی کے پیچھے پیچھے چل پڑنا یا ہو لینا۔ قافیہ، جو کسی نظم کے تسلسل میں ایک کے پیچھے ایک وارد ہوتا ہے، بھی اسی سے بنا ہوا لفظ ہے۔ آیہ کریمہ میں ایسی اتباع و پیروی کے خلاف صریحاً نہی وارد ہوئی ہے۔ جس نے اہل دانش و بصیرت کے لیے تو اس نوع کی پیروی کو ناممکن و حرام بنا دیا گیا ہے۔ بحالتِ خام عوام الناس کا معاملہ البتہ خود قرآنِ حکیم نے ہی اس سے جدا کر دیا ہے۔ جیسا کہ ابھی اوپر النساء: ۸۳ کے تحت ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا شخصی و انفرادی معاملات میں پھر بھی غلطی و کوتاہی کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر اجتماعی و قومی معاملات میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور قدرت کسی قوم کی اجتماعی غلطیوں کو کبھی معاف بھی نہیں کیا کرتی۔ اس لیے آنکھیں بند کر کے پیروی ہی کرتے چلے جانا اور اس کے نتائج و عواقب کی پرواہ تک نہ کرنا کم سے کم خیر امت (۳۶) کا شیوہ و شعار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اوپر لازم ہو چکا ہے کہ پلٹ کر اپنے پورے ماضی کا بغور جائزہ لیں۔ اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ کر اپنی سمت کو درست کر لیں۔ تاکہ نشاۃ نو کو ایک سازگار و محکم بنیاد میسر آسکے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے بھی ایک بیدار مغز و پر عزم اور باوقار قوم کی منزل کی جانب پیش قدمی ممکن و آسان ہو جائے۔

اسوۂ مبارکہ کے تحت اور کبار صحابہ کرام کے فیصلوں کی رو سے بھی زکوٰۃ فقط ریاست ہی کا حق ہے۔ اسے نجی شعبہ کے حوالے کرنے کا کوئی شرعی یا عقلی جواز نہیں بنتا۔ لہٰذا ہمیں اپنے ماضی کا بغور جائزہ لے کر اِن نیم جاں روایات کو از سر نو زندہ کرنا ہو گا۔ تبھی ایک صحت مند احیاء اور نشاۃ نو کی مضبوط بنیاد پڑے گی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مریم، آیت:۱۳۔

۲۔ مریم، آیت:۵۶۔

۳۔ مریم، آیت:۳۱۔

۴۔ بقرۃ، آیت:۲۱۹۔

۵۔ بقرۃ، آیت:۲۷۶۔

۶۔ رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر، التفسیر الکبیر، مکتبہ البہیہ، مصر، بلا سنِ طباعت، ص۹۹، ج۴، ح۷، البقرہ۲۷۵۔

۷۔ بقرۃ، آیت:۲۷۵۔

۸۔ جار اللہ زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، دار الکتاب العربی، مصر، ۱۹۴۷ء، ج۱، ص۳۲۱۔

۹۔ رازی، التفسیر الکبیر، ص۹۹، ج۴، ح۷، البقرہ، آیت ۲۷۵۔

۱۰۔ شامی، ابن عابدین، رد المحتار، مکتبۂ رشیدیہ، طباعت دوم، کوئٹہ، ۱۴۰۴ھ، ج۲، ص۲۴۔ (ملخص)

۱۱۔ قشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، بلا سنِ طباعت، ج۲، ص۳۵۔

۱۲۔ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، السیرۃ النبویہ، بر حاشیۂ الروض الانف، عبد التواب اکیڈمی، ملتان، بلا سنِ طباعت، ج۲، ص۳۵۱۔

۱۳۔ ایضاً، ج۲، ص۲۷۴۔

۱۴۔ قشیری، صحیح مسلم، ج۲، ص۳۷۔

۱۵۔ ایضاً، ج۲، ص۳۷۔

۱۶۔ رازی، التفسیر الکبیر، ص۹۱، ج۴، ح۷، البقرہ۲۷۵۔

۱۷۔ قشیری، صحیح مسلم، ج۲، ص۲۲۔

۱۸۔ بقرۃ، آیت:۲۷۶۔

۱۹۔ النسا، آیت:۶۰۔۶۱۔

۲۰۔ اٰلِ عمران، آیت:۱۳۰۔

۲۱۔ بقرۃ، آیت۲۷۸۔۲۸۰۔

۲۲۔ بقرۃ، آیت:۲۷۵۔

۲۳۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، قدیمی کتب خانہ، ۱۹۶۱ء، کراچی، ج ۱، ص ۱۹۹۔

۲۴۔ ایضاً، ج ۱، ص ۱۸۸۔

۲۵۔ محولہ بالا۔

۲۶۔ ابو عبیدہ، قاسم بن سلام، کتاب الاموال، تقدیم و تحقیق: ڈاکٹر محمد عمارہ، دار الشروق، بیروت، ۱۹۸۹ء، ص ۶۷۵۔

۲۷۔ القاری، ملا علی بن محمد سلطان،، شرح النقایہ، ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی، کراچی، بلا سنِ طباعت، ج ۱، ص: ۳۸۔ ۳۴۷۔

۲۸۔ ابو عبیدہ، قاسم بن سلام، کتاب الاموال، ص ۶۷۵۔

۲۹۔ توبہ، آیت: ۶۰۔

۳۰۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، میر محمد کتب خانہ، کراچی، بلا سنِ طباعت، ص ۱۴۰۔

۳۱۔ النساء، آیت: ۸۳۔

۳۲۔ فرقان، آیت: ۶۳۔

۳۳۔ بنی اسرآئیل، آیت: ۷۰۔

۳۴۔ بنی اسرائیل، آیت: ۳۶۔

۳۵۔ بلیاوی، عبد الحفیظ، مصباح اللغات، مادّہ: ''ق ف و''۔

۳۶۔ اٰلِ عمران، آیت: ۱۱۰۔